باسمہٖ تعالیٰ

اشارات

ہم میں سے کون شخص ہے جو ایٹم بم کے نام اور اس کی تباہ کاریوں سے واقف نہ ہو۔ اس کی فنی تفصیلات کا احاطہ تو ایک بڑا سائنسدان ہی کر سکتا ہے۔ ہم عامی آدمی اس سلسلہ میں صرف یہی کچھ جانتے ہیں کہ مادہ کی منظم دنیا جو بظاہر ٹھوس نظر آتی ہے۔ حقیقت میں محض قوت یا توانائی (ENERGY) کی لہروں کے سوا کچھ نہیں ہے۔ یہ لہریں ایک ترتیب اور نظم کے ساتھ ایک دوسرے کے گرد گردش کرتی ہیں۔ یہ گردش جس طرح بڑے بڑے اجرام فلکی میں موجود ہے اسی طرح چھوٹے چھوٹے ذرات میں بھی پائی جاتی ہے اور اسی سے ان کا وجود قائم ہے۔ سائنس دانوں نے کسی طریق سے ان لہروں کی ہم آہنگی کو ختم کر کے ان میں اختلال و انتشار پیدا کر دیا ہے اور یہی چیز انسانیت کے لئے زبردست ہلاکت کا باعث بنی ہے — ایک ایسی ہلاکت جس کے تصور سے بھی جسم پر لرزہ طاری ہو جاتا ہے اور جس کی کوئی دوسری نظیر تاریخ انسانی میں نہیں ملتی۔

مادہ کی طرح انسان کا اخلاقی وجود بھی افکار و تصورات اور احساسات کی لہروں سے مرکب ہے ان میں جب تک ہم آہنگی ہے۔ اس وقت تک انسانی قوتوں کا زیاں نہیں ہوتا لیکن جب بھی انہیں ایک دوسرے سے جدا کرنے کی کوشش کی جائے تو اس سے انسان اخلاقی طور پر بالکل تباہ ہو جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شعور و احساس کی یکجہتی اور ہم آہنگی وہ قوت ناظمہ ہے جو انسانی سعی و عمل کے مختلف گوشوں میں اتحاد و اتفاق پیدا کرتی ہے۔ انہیں باہم ایک دوسرے سے جوڑ کر ترقی کی راہ پر لگاتی ہے۔ اسی سے انسانی سیرت و کردار کے منتشر اجزا کے درمیان باہمی ربط پیدا ہوتا ہے اور اس طرح متناسب و متوازن شخصیت ابھر کر سامنے آتی ہے۔ ظاہر بات ہے کہ اگر حیاتِ انسانی کے مختلف عناصر کے مابین

کوئی قوتِ رابطہ باقی نہ رہے تو اس سے انسان کی صلاحیتیں بالکل ضائع ہو جاتی ہیں ۔

آپ کو اگر ایک فرد کے فکر و احساس میں اختلال کے نتائج کا صحیح اندازہ کرنا مقصود ہو تو آپ ایک ایسے شخص کی نفسیاتی کیفیات کا جائزہ لیں جسے عدالت کے کٹہرے میں یا بہ زنجیر کھڑا کر کے کسی خارجی دباؤ کے تحت خود اپنے خلاف ہی جھوٹی گواہی دینے پر مجبور کر دیا گیا ہو۔ یہ شخص اپنی جان کو تشدد سے بچانے کی خاطر اپنی زبان سے سب کچھ وہی ادا کرتا ہے جس کا استبداد اس سے تقاضا کرتا ہے۔ اس کے الفاظ بڑے موزوں اور اس کے فقرے بڑے بچے تلے ہوتے ہیں۔ لیکن یہ اس کے اپنے کارخانۂ دل سے ڈھل کر نہیں آتے۔ یہ سب غیروں کا مال ہوتا ہے جسے وہ اپنا کہہ کر منڈی میں بادلِ نخواستہ پیش کرتا ہے۔ یہ مستعار نغمات اس کے حلق کے صوتی تاروں کو تو بلاشبہ متحرک کرتے ہیں لیکن اس کے قلب کی گہرائیوں میں کوئی ارتعاش پیدا نہیں کرتے۔ جب زبان، دل کی لہروں میں توافق ختم ہو جائے تو اس سے انسان میں نہایت ہی خوفناک قسم کی نفسیاتی بیماریاں پرورش پانے لگتی ہیں جو بالآخر اُسے برباد کر کے رکھ دیتی ہیں۔ ایسے شخص میں ایک قسم کا تکلف سا پیدا ہو جاتا ہے اس کی حرکات و سکنات میں وہ بے ساختگی باقی نہیں رہتی جو ایک مخلص انسان کا طرۂ امتیاز ہے وہ اظہارِ مدعا کے لیے بالکل مصنوعی اداکاری سے کام لیتا ہے وہ ہر وقت اپنے آپ کو ایک ناگوار بوجھ تلے دبا ہوا پاتا ہے۔ اس کے چہرے پر ہمیشہ اضطراب کے آثار نمایاں رہتے ہیں تو وہ اپنی اس خانہ جنگی کو خواہ سنجیدگی کے کتنے موٹے موٹے پردوں میں چھپا کر رکھے لیکن ہر دیدہ ور شخص اس حقیقت کو بآسانی جان لیتا ہے کہ اس کے افکار و احساسات کی لہروں میں ایک زبردست کشمکش برپا ہے جس نے اس کے دل کی دنیا کو بالکل تہ و بالا کر دیا ہے اور یہ انتشار درون خانہ اسے اندر ہی اندر کھوکھلا کرتا جا رہا ہے ۔

ایک فرد کی طرح ایک قوم کے لئے بھی اس سے بڑی ہلاکت اور کوئی نہیں ہو سکتی کہ اس کے افراد کو خود اس کے نظریات و معتقدات خود اس کے اجتماعی شعور، تہذیبی امنگوں اور نصب العین کے خلاف صف آرا کر دیا جائے

کسی بڑے سے بڑے جوہری بم کا حملہ اپنے نتائج کے اعتبار سے اتنا مہلک اور تباہ کن ثابت نہیں ہوتا جتنا کہ ذہنی خلفشار۔ مادہ کی منظم لہروں کو ایک دوسرے سے جُدا کرنے سے بلا شبہ انسان کے ہاتھ میں ایک ایسا خطرناک ہتھیار آجاتا ہے جو آن کی آن میں ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں انسانوں کو بھسم کرکے رکھ دیتا ہے۔ لیکن وہ تباہی جو کسی قوم پر اس کی اخلاقی بنیادوں کو درہم برہم کر دینے سے مسلّط ہوتی ہے، وہ اس سے کہیں زیادہ ہے اس کی وجہ سے پوری قوم کی قوتیں ایک مرکز پر جمع نہیں ہونے پاتیں۔ وہ ہمیشہ بکھری ہوئی اور منتشر رہتی ہیں۔ اس قوم کی حالت اس کشتی کی سی ہوتی ہے۔ جو طوفانوں میں گھری ہوئی ہو لیکن جسے کھینے والے پوری محنت کے ساتھ اسے مخالف سمتوں کی طرف لے جانے کی کوشش کر رہے ہوں۔ اس قسم کے کوتاہ اندیش ناخدا اپنی قوتوں اور صلاحیتوں کا دیوالہ بھی نکال دیتے ہیں اور کشتی بھی ساحلِ مراد تک پہنچنے نہیں پاتی۔ وہ ہمیشہ طوفانوں میں گھری رہتی ہے اور آخرکار خود اپنے ہی کرم فرماؤں کی "مخلصانہ کوششوں" سے سمندر میں غرق ہو جاتی ہے۔

اگر ہم مسلم قوم کی پچھلی دو سو سالہ تاریخ کا مطالعہ کریں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ ہماری ملّت کے سفینہ کو بھی اس قسم کے ناخداؤں سے واسطہ رہا۔ انہوں نے یہ معلوم کرنے کی زحمت تک گوارہ نہ کی کہ جس کشتی کو وہ چلانے کا عزم رکھتے ہیں اس کے مسافروں سے یہ تو دریافت کر لیا جائے کہ آخر وہ جانا کہاں چاہتے ہیں۔ ان حضرات نے جب دوسری کشتیاں چلتی دیکھیں تو بغیر کسی غور و فکر کے ان کے ساتھ اپنی کشتی کو بھی حرکت دیدی۔ اس کے مسافر جن کی منزل دوسروں سے بالکل الگ اور جُداگانہ ہے کچھ دیر تو صبر سے دیکھتے رہے لیکن جب انہیں اس امر کا احساس ہوا کہ جس سمت کی طرف انہیں لے جایا جا رہا ہے وہ اُن کی اصل منزل نہیں تو ان کے اندر ایک سخت اضطراب پیدا ہوا۔ انہوں نے ایک طرف تو چپوؤں پر قبضہ کرنے کی کوشش کی اور دوسری طرف انہیں جو کچھ بھی میسّر آیا، اس کی مدد سے کشتی کو دوسری سمت میں لے جانا شروع کیا۔ ناخداؤں اور مسافروں کی اس باہمی آویزش سے دونوں کی قوتیں برباد ہو کر رہ گئیں اور "سفینۂ امت" ایک انچ بھی نصب العین کی طرف حرکت نہ کر سکا۔

ملّتِ اسلامیہ کے لیئے یہ کشمکش جو اس کے رہنماؤں اور عوام کے درمیان زمانۂ دراز سے مسلسل جاری ہے اپنے نتائج کے لحاظ سے بڑی افسوسناک ہے۔ اس کشمکش نے اس قوم کی صلاحیتوں کو آج تک کسی تعمیری کام پر لگنے نہیں دیا بلکہ ہمیشہ اسی سرپھٹول میں ضائع ہوئیں۔ مغربی امپیریلزم نے جن مسلم ممالک کو تاخت و تاراج کیا اُن میں ایک ہی بندھے منصوبے کے مطابق ان لوگوں کو اُبھارا گیا جو اپنے آقاؤں کی تہذیب و تمدن پر فریفتہ تھے اور دل و جان سے اس بات کے متمنی تھے کہ کسی طرح اس قوم کو بھی اُن کے رنگ میں رنگ دیا جائے لیکن ملّتِ اسلامیہ کے عام افراد کبھی بھی اس چیز پر راضی نہ ہوئے ان کے اندر ہمیشہ سے یہ احساس رہا ہے کہ ان کا رنگ اس رنگ سے بالکل مختلف اور جُدا ہے جس میں ان کے مغرب پرست رہنما انہیں رنگنا چاہتے ہیں مسلم عوام اپنی اُن روایات کو ترک کرنے پر راضی نہ تھے جن سے ان کے اجتماعی شعور کا خمیر اُٹھایا گیا ہے۔ انہوں نے ہمیشہ اپنے ماضی کی طرف پلٹنے کی کوشش کی۔ اُن کے دل میں ہر وقت یہ چھپا ہوا احساس رہا کہ جو کچھ ہونا چاہیے تھا وہ نہیں ہو رہا ہے۔ وہ اپنی ساری خامیوں کے باوجود ہر دور میں اس بات کے آرزو مند رہے ہیں کہ اُن کی زندگی کا نقشہ اُن خطوط پر مرتب ہونا چاہیئے جو انہیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور اُن کے جلیل القدر اصحاب سے ورثہ میں ملا ہے۔ یہ احساس کئی بار مختلف تحریکات کی شکل میں رونما ہوا اور یہی احساس وہ واحد قوت ہے جس نے اس ملّت کو ایک الگ قوم کی حیثیت سے آج تک زندہ رکھا ہے۔ جن لوگوں نے اس قوم کی نفسیات سمجھے بغیر اس کے فکر و احساس کی لہروں میں انتشار پیدا کرنے کی کوشش کی ہے انہوں نے اس پر سخت ظلم کیا ہے ایک ایسا ظلم جو ہلاکو اور چنگیز خان ایسے دشمنوں کے مظالم سے کہیں زیادہ ہے۔ ان حملہ آوروں نے تو زیادہ سے زیادہ مسلم ممالک کی دولت کو لوٹا، اُن کے باشندوں کو غلام اور لونڈیاں بنایا، اُن کے نوجوانوں کو ہلاک کیا۔ لیکن قوم کے اِن "مخلص ناخداؤں" کی کوششوں سے قوم کی تہذیب برباد ہوئی۔ اس کی روایات مٹائی گئیں۔ الغرض ہر وہ چیز جو کسی قوم کی حیاتِ اجتماعی کے لیے ضروری ہو سکتی ہے اسے ایک ایک کرکے نیست و نابود کیا جانے لگا۔

اس وقت شاید ہی دنیا کا کوئی ایسا اسلامی ملک ہو جس میں "مغرب پرست" رہنماؤں کا کوئی گروہ اس

قسم کا احمقانہ کھیل نہ کھیل رہا ہو۔ ترکی، مصر، شام، ایران، پاکستان الغرض دنیا کے ہر اس خطہ میں جہاں مسلمانوں کی اکثریت آباد ہے، یہ کشمکش جاری ہے اور اس طرح مسلم قوم کی صلاحیتیں بالکل مفت میں برباد ہو رہی ہیں۔ مغربی طرز فکر کے حاملین جنہیں بدقسمتی سے آج قوم کی سربراہی کا منصب بھی حاصل ہے اس کا ماضی سے رشتہ توڑ کر اسے بالکل مغربی تہذیب کا پرستار بنانا چاہتے ہیں۔ دوسری طرف وہاں کی بھاری اکثریت ان لوگوں کے ان عزائم کو نہایت حقارت کی نگاہ سے دیکھتی ہے اور ان کا ساتھ دینے پر تیار نہیں ہوتی۔ اس طرح قوم کے اپنے لوگ ہی ایک دوسرے کے خلاف برسرپیکار ہیں۔

ان اوراق میں ہم صرف ایک ملک یعنی ٹرکی اور اس کے صرف ایک شعبہ زندگی یعنی تعلیم و تربیت میں اس کشمکش اور اس کے نتائج سے اپنے قارئین کو روشناس کرانے کی کوشش کریں گے اور بتائیں گے کہ اس قسم کی کوششیں جن کی پشت پر حکومت کی قوت اور اس کے ذرائع و وسائل موجود تھے کیونکر ناکام ہوئیں۔ اس ضمن میں ہم جو معلومات پیش کر رہے ہیں وہ ہم نے مشہور عیسائی رسالے مسلم ورلڈ (MUSLIM WORLD) کے دو شماروں سے اخذ کی ہیں۔ یہ پرچہ اسلام سے سخت عناد رکھتا ہے اور کسی مسلمان قوم میں اسلامی احساسات کی زندگی اس کو سخت ناگوار ہے۔ اس لیے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس نے یہ معلومات اس بات کا ثبوت دینے کے لیے فراہم کی ہیں کہ ٹرکی میں لامذہبیت کو فروغ دینے کی کوششیں غلط تھیں۔ پھر ان کو جس شخص نے فراہم کیا ہے وہ بھی کوئی "تنگ نظر ملا" نہیں جس نے تعصب اور جانبداری سے کام لیتے ہوئے مصطفےٰ کمال کی مساعی کو جان بوجھ کر ناکام ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کا مہیا کرنے والا ایک مسیحی پادری ہاورڈ اے ریڈ (HOWARD A. REED) ہے جس سے بڑھ کر شاید ہی کسی کو ایک مسلمان قوم کے نامسلمان ہو جانے سے خوشی ہو سکتی ہو گی اس لیے اس کی فراہم کردہ معلومات پر یہ شک نہیں کیا جا سکتا کہ یہ اسلام کے حق میں اور سیکولرزم کے خلاف کوئی پراپیگنڈا ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے مغرب پرست حضرات آنکھیں کھول کر ان معلومات کو دیکھیں اور پھر غور کریں کہ ایک قوم کی حکومت اپنی قوم کی روایات اور اس کے اجتماعی شعور سے لڑ کر آخر کیا حاصل کرتی ہے۔

دنیا کا ہر تمدن تین بنیادوں پر قائم ہوتا ہے، ماں کی گود، تعلیم و تربیت کے گہوارے اور زبان۔ جب تک انہیں تبدیل نہ کیا جائے اس وقت تک کوئی ایسا تمدن بدلا نہیں جا سکتا جس کی جڑیں انسان کے دل و دماغ میں پیوست ہو چکی ہوں۔ اتاترک اور ان کے ساتھیوں نے اس حقیقت کو اول روز سے ہی اچھی طرح جان لیا تھا چنانچہ انہوں نے اپنی قوم کو مغربی رنگ میں رنگنے کے لیے ضروری سمجھا کہ ان تینوں کو تبدیل کیا جائے۔ ان کی سب سے پہلی زد اُن مدارس پر پڑی جہاں دینی تعلیم دی جاتی تھی۔ حکومت کی پوری مشینری کو حرکت میں لاکر ان مدارس کے خلاف ایک نفرت کی فضا تیار کی گئی۔ انہیں جہالت کے اڈوں سے تعبیر کیا جانے لگا اور قوم کے دل میں یہ بات ڈالنے کی کوشش کی گئی کہ وہ جب تک انہیں ختم نہیں کرتی اُس وقت تک اس کے لیے ترقی کے سارے دروازے مسدود رہیں گے۔ ۱۰ ستمبر ۱۹۲۵ء کو اتاترک کے سامنے "چند سر پھروں" نے یہ عرضداشت پیش کی کہ دینی مدرسے کھولنے کی پھر سے اجازت دے دی جائے۔ اس درخواست کو نہایت حقارت آمیز طریقے سے ٹھکراتے ہوئے ترکی جدید کے بانی نے کہا: "یہ مدارس دراصل برائی کے وہ اڈے ہیں جہاں سے قوم کو ہمیشہ نقصان پہنچتا رہا ہے" پھر اس نے عرضداشت پیش کرنے والے مذہبی گروہ سے یوں خطاب کیا: "تمہیں اگر یورپین طرز کے اسکول نہیں چاہئیں تو کوئی مضائقہ نہیں، قوم ان کو چاہتی ہے اس غریب قوم کے غریب بچوں کو تہذیب و تمدن میں ترقی کرنے دو۔ دینی مدرسے ہرگز دوبارہ جاری نہیں ہونے دیئے جائیں گے۔ قوم کی خدمت کے لیے نئی طرز کے ہی اسکول مطلوب ہیں۔"

مصطفےٰ کمال نے ان دینی مدارس کے متعلق جو طرز عمل اختیار کیا اُس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان اداروں میں پڑھنے والوں کی تعداد آہستہ آہستہ گھٹنے لگی اور اس طرح یہ مراکز خود اپنے ہی فرزندوں کی سرد مہری کا شکار ہو کر دم توڑنے لگے ۱۹۲۴ء میں ان سے استفادہ کرنے والے طلبا کی تعداد ۲۴۲ تھی ۱۹۳۳ء میں وہ گرتے گرتے صرف بیس رہ گئی۔

اس پالیسی کی لپیٹ میں جو دوسری چیز آئی وہ عربی زبان تھی۔ کسی قوم کی زبان اُس کے افراد کے درمیان محض اظہارِ خیال کا ذریعہ ہی نہیں ہوتی۔ بلکہ یہ وہ زبردست قوت ہے جس سے احساسات و کیفیات کی ساری منتشر

طاقتیں شخصیت کی گہرائیوں میں سموئی جاتی ہیں۔ اسی سے ہمارے اندر ایک خاص ذہنی میلان پیدا ہوتا ہے جو بالآخر ایک خاص طرز فکر اور ایک خاص قسم کی سیرت و کردار پر منتج ہوتا ہے اسی سے ہمارے اجتماعی شعور کا ہیولیٰ تیار کیا جاتا ہے اور اسی کی وساطت سے ایک دم اپنے ماضی اور اس کی تاریخی روایات سے وابستہ رہتی ہے۔

عربی زبان کی اہمیت تو مسلم قوم کے لیے اور بھی زیادہ ہے۔ یہ وہ زبان ہے جس میں ہیں احکام الٰہی ملے ہیں۔ جس کے ذریعہ ہمارے ہادیٔ برحق نے ہم تک اللہ کا پیغام پہنچایا ہے۔ ہمارا بیشتر دینی سرمایہ اسی زبان میں ہے اس کے علاوہ یہ وہ قوت رابطہ ہے جس نے مسلم ممالک میں بسنے والے مسلمانوں کے درمیان یگانگت پیدا کی ہے اور ہمیں ایک وحدت قومی میں پرو دیا ہے۔ اس لیے جو فرد بھی اس زبان کے خلاف کوئی قدم اٹھاتا ہے وہ دراصل دین کے خلاف کارروائی کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔

دنیا کی کوئی قوم ایسی نہیں جس نے زبان کی اہمیت سے انکار کیا ہو۔ اس لئے جب بھی کسی غیر ملکی قوم نے ایک دوسری قوم کو باہر سے آکر غلام بنایا تو اس نے اپنی استعماریت کی جڑیں مضبوط کرنے کے لیے سب سے پہلے زبان بدلنے کی کوشش کی، کیونکہ اُسے اچھی طرح معلوم تھا کہ زبان کے ڈھانچے بدل دینے سے قلب و نگاہ کے زاویئے بدل جاتے ہیں۔ آج ہندوستان میں اردو کے خلاف جو مہم جاری ہے وہ اس چیز کا بیّن ثبوت ہے ہمارے اپنے ملک کے رہنے والے بھی اس حقیقت سے اچھی طرح واقف ہیں کہ انگریزی تہذیب و تمدن کو یہاں قائم رکھنے کے لیے انگریزی زبان کتنی ضروری ہے اور ہمارا برسر اقتدار طبقہ اس کو یہاں رواج دینے کے لیے کیا کچھ کوششیں کر رہا ہے۔ زبان درحقیقت ایک تہذیب کا نشان (SYMBOL) ہوتی ہے

اتاترک اس صورت حال سے پوری طرح آگاہ تھا۔ چنانچہ اُس نے جب ترکوں کا تعلق اسلامی روایات سے توڑنا چاہا تو سب سے پہلے انہیں عربی زبان کو ترک کرنے کی تعلیم دی۔ یہ کام بڑی ہوشیاری سے سرانجام پایا۔ سب سے پہلے لوگوں کے ذہن میں اس خیال کو راسخ

کیا گیا کہ عبادت انسان کو ایسی زبان میں کرنی چاہیئے جس کے معانی و مطالب سے انسان اچھی طرح واقف ہو۔ جب لوگ اس بات پر کسی حد تک مطمئن ہو گئے تو پھر ان سے نہایت ہی معصومانہ انداز میں یہ کہا گیا کہ اس مقصد کے لیئے ایک انسان کی مادری زبان کے سوا اور کون سی زبان زیادہ موزوں ہو سکتی ہے۔ کچھ مدت گذر جانے کے بعد ان کا ذہن اس طرف منتقل ہونے لگا کہ یہ عربی زبان تو ایک غیر ملکی قوم کی زبان ہے اس لیے ہماری آزادی کی تکمیل بجز اس کے ممکن نہیں کہ اسے زندگی کے سارے شعبوں سے یکسر خارج کر دیا جائے۔ چنانچہ اس پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کے لیئے ترکی زبان میں نماز ادا کرنے اور اذان دینے کا طریقہ رائج کیا گیا۔ یہ تبدیلی اسلام کے خلاف ایک گہری سازش تھی جسے ترک قوم شروع میں تو پوری طرح نہ سمجھ سکی لیکن جونہی اس طرف کچھ مزید قدم اٹھائے گئے تو پھر اس پر اصل حقیقت روشن ہو گئی اور اس نے اس تحریک کی مزاحمت شروع کر دی۔ یہاں تک کہ پہلے ترکی نماز کا قصہ ختم ہوا اور آخر کار پچیس سال کے بعد ترکی اذان کی جگہ پھر سے عربی اذان کی اجازت دینی پڑی۔

اس پروگرام کا تیسرا جزو یہ تھا کہ ترکی زبان کا رسم الخط عربی سے لاطینی کر دیا جائے۔ یہ تبدیلی بھی نتائج کے اعتبار سے کچھ کم اہم نہ تھی۔ اس کا پہلا اثر یہ ہوا کہ ترکی قوم آس پاس کی تمام اُن مسلمان قوموں سے کٹ گئی جن کے ساتھ صدیوں سے اس کا تعلق تھا اور ان مغربی قوموں سے اس نے رشتہ جوڑنا چاہا، جن کے ساتھ اس کا کوئی رشتۂ اشتراک قائم نہ ہو سکتا تھا اور نہ ہوا۔

اس کا دوسرا نتیجہ یہ ہوا کہ ترکی قوم کا رشتہ خود ترکی زبان بولنے والے اُن لوگوں سے بھی منقطع ہو گیا جو ترکی کے باہر پائے جاتے تھے اور جو ابھی پرانے رسم الخط ہی میں لکھنے اور پڑھنے کے عادی تھے۔

اس تبدیلی سے ملک کے باشندوں کے لیے اُن کی پچھلی نسلوں کا سارا علمی و ادبی کارنامہ ایک اجنبی چیز بن کر رہ گیا جو صدیوں کے دوران میں فراہم ہوا تھا۔ ترکی قوم اپنے ماضی سے کٹ گئی۔ یہ گویا اس امر کا اعلان تھا کہ پچھلی صدیوں کے دوران میں ترک قوم کوئی ایسی چیز پیدا کرنے کے قابل نہ تھی جس پر اس کے اخلاف فخر کر سکیں اور جسے زندہ رکھنے کے لیے قابل قدر پائیں۔ اب وہاں صورت حال

یہ ہے کہ اس ملک کے کتب خانوں میں ترک علماء و فضلاء اور اہل قلم کی بے شمار کتابیں بیکار پڑی ہیں جنہیں پڑھنے اور سمجھنے والا ملک میں کوئی نہیں ہے۔ اس معاملے میں لطف کی بات یہ ہے کہ اب مذہبی تعلیم کے از سر نو آغاز کے بعد ترکوں کو بھی یہ ضرورت پیش آئی ہے کہ اپنے اماموں اور خطیبوں اور فوج کے مذہبی معلموں اور دیگر دینی مدارس کے اساتذہ اور طلبا کو اس قابل بنائیں کہ وہ پچھلے زمانے کے ترک علما کی کتابیں پڑھ سکیں۔ اس غرض کے لیے اب ان لوگوں کو خود اپنی ہی زبان کے پرانے رسم الخط کی تعلیم اس طرح دی جا رہی ہے جیسے کسی غیر ملکی زبان کی تعلیم دی جاتی ہے اور دینیات کے نئے نصاب میں پرانی ترکی (تیس چالیس برس پہلے کی زبان) سکھانے کا انتظام کیا گیا ہے۔

تمدن اسلامی کے قصر کو گرانے کے لیے چوتھا حملہ اس کے سب سے زیادہ طاقتور مرکز یعنی مسجد پر کیا گیا۔ یہاں بھی ایک گہری چال کے ذریعہ پہلے عوام کے اندر اس احساس کو ابھارنے کی کوشش کی گئی کہ عبادت وہی صحیح ہے جس سے انسان کو روحانی سرور حاصل ہو، اس لئے طریق عبادت پر تحسین اور روح پرور ہونا چاہیے۔ اس احساس کے اندر بظاہر کوئی پہلو قباحت کا نہ تھا۔ لیکن اس مقصد تک پہنچنے کے لیے جو ذرائع استعمال کیے گئے وہ وہ تھے جنہیں اسلام نے بالکل حرام قرار دیا ہے۔ یعنی گانے بجانے کے ذریعہ انسان کی روحانی لذت کا سامان فراہم ہونے لگا۔ اس سلسلہ میں ۲۰ جون ۱۹۲۸ء کے اخبار "وقت" میں جو فرمان شائع ہوا وہ پڑھنے کے قابل ہے۔ اس میں کہا گیا ہے:

> "تیسری ضرورت طریق عبادت میں تغیر کی ہے ہمیں ایسے ذرائع و وسائل اختیار کرنے چاہئیں جن سے پرستش خداوندی بڑی دلچسپ، پرکشش اور روح افزا بن جائے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے ضروری ہے کہ ہم کویوں اور اماموں کا ایک ایسا گروہ تیار کریں جو فن موسیقی کے اسرار و رموز سے پوری طرح واقف ہو۔ اس لیے ہمارے معابد میں آلات موسیقی کا وجود بے حد ضروری ہے۔ خصوصاً وہ آلات جو جدید طرز کے اور مقدس ہیں" (یعنی جو کلیساؤں میں استعمال ہونے کی وجہ سے مقدس ہو گئے ہیں)

یہ تبدیلی کچھ اس وجہ سے نہ تھی کہ مصطفٰے واقعی ترک قوم کی نمازوں میں روحانی سرور پیدا کرنے کا خواہشمند تھا بلکہ اس سے اصل مقصود نماز کی اسپرٹ کو ختم کرنا اور مسلمانوں کی عبادت کو اہلِ مغرب کی عبادت سے مشابہ بنانا اور مسجد سے مسلمانوں کے تعلق کو وہی رنگ دے دینا تھا جو چرچ سے اہل مغرب کے تعلق کا ہے۔

لیکن اس کا حاصل بھی قوم کے اجتماعی ضمیر اور قوم کے فرمانرواؤں کے درمیان کشمکش بڑھانے کے سوا اور کچھ نہ ہوا۔ قوت۔ اور ذرائع و وسائل کا اچھا خاصا حصہ اس احمقانہ اسکیم کو نافذ کرنے میں برباد ہوا اور آخر کار ترک قوم کے شعور کو اس بات پر کسی طرح راضی نہ کیا جا سکا کہ وہ اپنی مسجدوں کو کلیساؤں کے سانچے میں ڈھال لے۔

تہذیب و تمدن کو اس طرح تبدیل کرنا کوئی کھیل نہ تھا جو یونہی رواروی میں بغیر کسی شدید محنت کے سرانجام پا جاتا۔ یہ ایک بڑا ہی سخت کام تھا جسے برسوں کی مسلسل مشقت اور ایک نہایت ہی ہولناک ظلم و ستم کی مدد سے پایۂ تکمیل کو پہنچانے کی کوشش کی گئی۔ ایسا ہونا بالکل ایک فطری امر تھا۔ کیونکہ اس انقلاب کا مقصد لوگوں کے صدیوں کے تصورات کو بیخ و بن سے اکھاڑ کر ان کی جگہ بالکل نئے تصورات اور اعتقادات کو رواج دینا تھا۔ اس کے پیچھے زبردست عزائم کارفرما تھے۔ اسے لانے کے لیے زرِ کثیر خرچ کیا گیا، اس کے راستے میں جو قوتیں مزاحم ہوئیں انہیں کچل کے رکھدیا گیا، تب کہیں جا کر ترکی قوم کے لباس اور زبان کو تبدیل کیا جا سکا۔

جب لوگوں نے حالات کا بالکل سطحی مشاہدہ کیا انھوں نے یہ گمان کر لیا کہ یہ تبدیلی جو جبراً لائی گئی ہے کسی انقلابِ فکر و نظر کا نتیجہ ہے۔ اس تجربے سے ان زعماء قوم کو بڑی توقعات وابستہ تھیں۔ وہ یہ سمجھ بیٹھے تھے کہ اسلامی تہذیب و تمدن کو مٹانے اور مغربی تہذیب کو اپنانے کی یہ کوششیں اس قوم کے سارے مسائل کو حل کر دیں گی اور یہ قوم اب اسی راہ پر چلتی رہے گی جس پر انھوں نے اسے ڈال دیا ہے مگر مغربی تہذیب و تمدن کا پودا یہاں پوری طرح بار آور ہونے بھی نہ پایا تھا کہ اس سے بے اطمینانی کے آثار نمودار ہونے شروع ہو گئے۔ اس شجرِ خبیث نے جو پھل ترکی قوم کی جھولی میں گرائے ہیں وہ اتنے تلخ اور کڑوے ہیں

کہ اس نے خود اس شجر کی آبیاری کرنے والوں کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا ہے اور اب وہ دوسرے انداز سے سوچنے پر اپنے آپ کو مجبور پاتے ہیں اس کے ساتھ انہیں اب اس امر کا پورا احساس ہو رہا ہے کہ ایک مسلمان قوم کے دل و دماغ میں کسی غیر اسلامی تہذیب کی جڑیں مضبوطی سے گاڑی نہیں جاسکتیں۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اب ترکی میں اس تہذیب کے خلاف ایک ردِ عمل شروع ہو رہا ہے، اور اس ردِ عمل کی شہادت بھی ہم اس پادری ہی کے مضمون سے پیش کرتے ہیں۔ جس نے اسے بڑے رنج و افسوس اور احساسِ خطر کے ساتھ بیان کیا ہے۔

یہ حقیقت اپنی جگہ مسلم ہے کہ اتاترک کی ساری کوششوں کے باوجود ترکی قوم اسلام کو خیرباد کہنے پر آمادہ نہ ہوئی۔ وہ اس سے ہمیشہ وابستہ رہنا چاہتی تھی اور اس بنا پر وہ ہر آن اس بات کے لئے کوشاں رہی کہ اس دین سے اس کا تعلق کسی نہ کسی صورت قائم ضرور رہے۔ اس نے ۱۹۲۵ء میں اس بات کا اہتمام کیا کہ کسی طرح کم از کم ایک دو دینی مراکز اس "طفلِ نادان" اور اس کے انجان ساتھیوں کی دستبرد سے بچالئے جائیں۔ چنانچہ وہ شعبۂ امور مذہبی کے تحت صرف ایک دینی مدرسہ کو محفوظ رکھنے میں کامیاب ہوئی جس میں قرآن کی تعلیم کا انتظام تھا۔ اس مدرسے کو حکومت کی طرف سے ایک پائی کی امداد بھی حاصل نہ تھی۔ یہاں کے فارغ التحصیل لوگوں کے لیے سرکاری ملازمتوں کے سارے دروازے بند اور ترقی کی ساری راہیں مسدود تھیں پھر پوری قوم کو میخانۂ مغرب سے جام پلا پلا کر بدمست کر دیا گیا تھا۔ لیکن ان حالات میں بھی بعض لوگ ایسے سخت جان نکلے جنہوں نے دنیاوی فوائد کو یکسر ٹھکراتے ہوئے محض آخرت کی خاطر اس مدرسہ سے کتابِ الٰہی اور سنتِ رسول کی تعلیم حاصل کی اور ان لوگوں کی مساعی میں خداوند تعالیٰ نے اس قدر برکت عطا کی کہ بہت جلد ہی لوگوں کے دلوں میں دینی تعلیم کی ضرورت کا احساس بڑھنے لگا۔ اس کا اندازہ مذکورہ بالا مدرسے کے متعلق مندرجہ ذیل اعداد و شمار سے بآسانی لگایا جا سکتا ہے:

سال	تعداد اسباق	تعداد اساتذہ	تعداد طلبہ	تعداد طالبات	کل تعداد
۱۹۲۵ء	۱۰	۹			۳۵

سال	تعداد اسباق	تعداد اساتذہ	تعداد طلبہ	تعداد طالبات	کل تعداد
سنہ ۱۹۳۲ء	۹	۹			۲۳۲
سنہ ۱۹۴۵ء	۶۱	۶۵	۲۰۲۱	۷۴۴	۲۷۶۵
سنہ ۱۹۴۸ء	۱۲۲	۱۳۰	۳۰۴۲	۱۴۸۸	۵۵۳
سنہ ۱۹۴۹ء	۱۲۷	۱۳۰	۶۴۰۳	۲۳۰۳	۸۷۰۶

یہ تو ہے دینی تعلیم میں طلبا کی بڑھتی ہوئی دلچسپی کا حال۔ اب رہے وہ مدارس جو صرف مغربی تہذیب و تمدن کو ترقی دینے کے لئے قائم کیے گئے تھے اور جنھیں مذہبی تعلیم سے بالکل خالی رکھنے کا اہتمام کیا گیا تھا وہاں بھی حالات کے ہاتھوں مجبور ہو کر آخر کار مذہبی تعلیم کو لازمی قرار دینا پڑا اور آج طلبہ بڑے ذوق و شوق سے اسے حاصل کرتے ہیں ۔

جدید مدارس میں دینی تعلیم کا اجرا تین محرکات کا نتیجہ ہے ان میں سب سے پہلا محرک یہ تھا کہ طلبہ کی اخلاقی حالت بڑی سرعت کے ساتھ بگڑ رہی تھی اور ترکی پارلیمنٹ تک یہ شکایت کی جانے لگی تھی کہ نئی نسلوں کے دل سے والدین کا ادب و احترام ختم ہوتا جا رہا ہے۔ دوسرے ترکی فوج نے اس بات کا مطالبہ کیا کہ اسے نماز پڑھانے اور اسلامی تعلیمات سے روشناس کرنے کے لیے اماموں کی ضرورت ہے۔ تیسرے ترکوں میں یہ عام احساس پیدا ہونے لگا کہ روسی کمیونزم کی تبلیغ کے مقابلے میں اگر ترک نوجوانوں کو اسلام کی تعلیم نہ دی گئی تو روس کے کسی حملے کے بغیر ہی ترکی محض کمیونزم کی تبلیغ کے ذریعہ روس کے لئے مسخر ہو جائے گا۔ ان حالات کی بنا پر حکومت کو اپنی تعلیمی پالیسی بدلنی پڑی۔

ترکی عوام نے جس گرمجوشی کے ساتھ اس نئی پالیسی کا خیر مقدم کیا اس کا اندازہ لگانے کے لیے صرف ایک مثال کافی ہے۔ حکومت کی طرف سے جب سرکاری مدارس میں دینی تعلیم کی اوّل اوّل اجازت دی گئی تو ساتھ یہ شرط بھی عائد کر دی گئی کہ دینیات پڑھنے کے لئے طلبہ کو اوقاتِ مدرسہ کے بعد بیٹھنا ہوگا اور جو اساتذہ اسے پڑھانا چاہیں وہ بھی کسی معاوضہ کی توقع کیے بغیر ہی پڑھائیں۔ ان دشواریوں کے باوجود

بے شمار اساتذہ اور طلباء اس کے لیے تیار ہو گئے ۔ آخرکار وزیر اعظم کو اپنی پالیسی میں مزید تغیر کرنے پہ مجبور ہو کے یہ اعلان کرنا پڑا ۔

"نئی حکومت اعلیٰ مدارس میں مذہبی تعلیم کے سوال پر غور کرے گی تاکہ مذہبی آدمیوں کو صحیح طور پر تربیت دی جا سکے ۔ یہ ہماری قوم کا تقاضا ہے ۔"

۱۰ اکتوبر ۱۹۴۹ء میں پانچویں اور چھٹے درجے میں مذہبی تعلیم لازمی قرار دے دی گئی ۔ لیکن قانون میں اس امر کی پوری گنجائش تھی کہ جو والدین اپنے بچوں کو اس سے مستثنیٰ رکھنا چاہیں انہیں اس کا پورا اختیار ہو گا ۔ جب والدین سے اس معاملہ میں رجوع کیا گیا تو ۹۰ فیصدی لوگوں نے اس تعلیم کے حق میں رائے دی

اسی طرح وہاں مذہب کے بارے میں نوجوان لڑکوں کے احساسات معلوم کرنے کے لیے ۲۶۲ بچوں سے اپریل ۱۹۵۶ء میں انٹرویو لیے گئے ۔ ان سے پتہ چلا کہ ۸۹ سے لے کر ۹۴ فیصد بچے مذہب کی ضرورت محسوس کرتے ہیں ۔ ۸۰ سے لے کر ۸۹ فیصد کا مذہب پر پختہ ایمان ہے ۔ مذہب کے حق میں اس عام رجحان کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ مساجد میں نمازیوں کی تعداد بڑھتی چلی جا رہی ہے ۔ جب نئے جوانوں سے ان کے تاثرات معلوم کرنے کی کوشش کی گئی تو ان میں سے ۸۰ فیصد نے اس تبدیلی کو خوش آئند کہا ترکی کی بھاری اکثریت اس بات پر پورا یقین رکھتی ہے کہ اسلام ہمارے جدید تقاضوں کو بڑی خوش اسلوبی سے پورا کر سکتا ہے ۔

یہ سارے واقعات جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے وہ اس بات کی زندہ شہادت ہیں کہ ترکی قوم اب پھر مذہب کی طرف متوجہ ہو رہی ہے اور دربدر کی ٹھوکریں کھانے کے بعد اسے اس بات کا احساس ہو چکا ہے کہ مذہب سے اس کا انحراف کسی طرح بھی اس کے لئے مفید ثابت نہیں ہوا ۔

اتاترک اور اس کے ساتھیوں کی کوششوں کا یہ حشر دیکھ کر ایک انسان کے دل میں قدرتی

طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ دنیا کی بے شمار قومیں ایسی ہیں جنہوں نے جب ایک دفعہ مذہب کو ترک کیا تو پھر کبھی مڑ کے بھی اس کا نام نہ لیا۔ لیکن یہ ملت باوجود ہزار جدوجہد کے بھی من حیث القوم اپنے مذہب کو ترک کرنے کے لیے تیار نہ کی جا سکی۔

اس کی سب سے بڑی وجہ صرف یہ ہے کہ دوسری اقوام نے اپنی قومیت کی تشکیل خالص مادی بنیادوں پر کی ہے یعنی رنگ، نسل، زبان، سیاسی اور معاشی وحدت سے قومیت کا خمیر اُٹھایا گیا ہے۔ ان میں سے بے شمار قومیں ایسی بھی ہیں جو مادیت کو نہایت حقارت کی نگاہوں سے دیکھتی ہیں لیکن قومیت کے بنانے میں انہوں نے بھی خاک و خون ایسے مادی رشتوں کا ہی سہارا لیا ہے۔ مذہب خواہ وہ اس کی کتنی ہی عزت و توقیر کرتے ہوں۔ لیکن اُن کے ہاں وہ ایک ایسی قوت نہیں جو انہیں ایک دوسرے سے جوڑ سکے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی اجتماعی زندگی میں اپنے مذہبی معتقدات کو کسی طرح بھی اثر انداز نہیں ہونے دیتے۔ مذہب کے معاملہ میں ان کا رویہ بالعموم غیر جانبدارانہ ہوتا ہے۔ لیکن وہ ایک تانیہ کے لیے کسی ایسی چیز کو برداشت نہیں کر سکتے جس کی زد اُن کی قومیت پر پڑے۔

ملت اسلامیہ کا معاملہ دنیا کی ساری قوموں سے بالکل مختلف ہے۔ اس نے دُنیا اور اس کے متعلقات سے اپنے ماننے والوں کے اندر کوئی نفرت تو پیدا نہیں کی۔ لیکن حیاتِ اجتماعی کی تشکیل میں کسی مادی رشتے سے قطعاً کوئی کام نہیں لیا۔ اس نے یہ کام صرف چند اعتقادات سے لیا ہے۔ اس بنا پر مسلم قومیت کی بنیاد نہ اشتراکِ زبان پر رکھی گئی ہے، نہ اشتراکِ رنگ و نسل اور نہ ہی اشتراکِ وطن پر، بلکہ سارے مسلمان اس برادری میں جو جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم نے قائم فرمائی تھی اس لیے شریک ہیں کہ "مظاہرِ کائنات کے متعلق ان سب کے معتقدات کا سرچشمہ ایک ہے[۱]"

اس بنیادی فرق کو سمجھ لینے کے بعد اب آپ اس حقیقت کو آسانی کے ساتھ جان سکتے ہیں کہ مسلمان مذہب کو خیرباد کہنے پر کیوں تیار نہیں ہو سکتا۔ وہ کیوں ان لوگوں کے ساتھ تعاون نہیں کرتا جو اسے اس سے

[۱] ڈاکٹر اقبال مرحوم

دُور لے جانے کی کوشش کرتے ہیں؟ وہ کیوں اُن سب حضرات کو شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھتا ہے جو اس کا ماضی سے رشتہ منقطع کرتے ہیں؟ اس کی وجہ صاف ظاہر ہے۔ ہمارا مذہب ہماری حیاتِ اجتماعی میں صرف ایک عنصر کی حیثیت سے شامل نہیں بلکہ یہ ہماری زندگی کا مبدا اور اساس ہے اس لئے ہم مذہب کو خیرباد کہہ کر ایک قوم کی حیثیت سے زندہ نہیں رہ سکتے۔ ہمارے لیے یہ ممکن نہیں کہ ہم جیتے جی مذہب سے منہ موڑ کر کسی دوسرے طریقِ فکر کے مطابق کام کرسکیں یا اجتماعی زندگی کی کوئی ایسی شکل گوارا کرلیں جو ہمارے مذہبی احساسات و تخیلات سے بالکل مغائر ہو۔ مذہب کا وجود ہی ہماری زندگی کی سب سے بڑی علامت ہے۔ دنیا کا کون سا ایسا بیوقوف ہے جو خود اپنے ہاتھ سے اپنی قبر کھودنے پر تیار ہو جائے۔

ہماری قوم میں سے جب بھی کوئی شخص نئے عزائم اور ولولے لے کر اٹھتا ہے تو ہم کچھ دیر اُس کے ساتھ چلتے ہیں۔ لیکن ہمیں جونہی یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ ہمیں مذہب سے دُور لے جانا چاہتا ہے تو ہم فوراً اس سے کھٹک جاتے ہیں اور اس کے ساتھ ہمارا دلی تعاون ختم ہو جاتا ہے۔ کیونکہ ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ اس منزل سے دُور ہٹ جانے کے بعد خود ہماری زندگی بھی ختم ہو جائے گی۔ اسی وجہ سے اگر ہم آج ایک شخص کے پیچھے چلتے ہیں، تو کل دوسرے کے۔ ہم ہر روز اپنے لئے نئے نئے راہنما تلاش کرتے ہیں اور پھر ان سے جلد مایوس ہو کر انہیں چھوڑتے بھی جاتے ہیں۔ ہماری حالت غالب کے اس مسافر کی سی ہے جس کے متعلق اس نے کہا تھا ؎

چلتا ہوں تھوڑی دُور ہر اک راہرو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

ہماری اس سیمابی کیفیت نے ہمیں سخت نقصان پہنچایا ہے اس سے ہماری صلاحتیں اور قوتیں ضائع ہوئی ہیں خدا کرے کہ اس قوم کے سربراہ اس قوم کے مزاج کو سمجھ لیں اور اس طرح اس کے فکر و احساس کی لہروں میں انتشار و اختلال کی بجائے پھر سے ہم آہنگی پیدا ہو جائے۔